بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

ایک شخص نے اٹھ کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ اعلان کیا کہ آؤ، میرے پیچھے چلو، میں دین کا جھنڈا بلند کروں گا۔ مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اُس نے ان کے سامنے دھواں دھار تقریر کی اور پورے زور کے ساتھ اس ارادے کا اظہار کیا کہ صدیوں سے دین حق کی جو عمارت ویران پڑی ہے، اب انشاءاللہ وہ میرے ہاتھوں از سر نو اپنی اصلی شان میں قائم ہوگی۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا۔ لوگ انتظار کرنے لگے کہ اب یہ تجدید دین کا مدعی خود آگے بڑھ کر اذان دیگا اور ہمیں مسجد کی طرف لے چلے گا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہؤا۔ آخر لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ حضرت اب دین کے پہلے ستون کو قائم کرنے کا وقت آگیا ہے، حضور صدائے اذان بلند فرمائیں۔ لیکن ہر تقاضے کو وہ ایک کان سن کر دوسرے کان اڑاتا رہا اور جس نے بہت تنگ کیا اسے طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے ٹال دیا۔ آخر کار جب نماز کا وقت تنگ ہونے لگا تو سارا مجمع چیخ اٹھا، ہر طرف سے مطالبہ ہؤا کہ اذان دی جائے۔ مجبور ہو کر بے چارے نے بادلِ ناخواستہ اذان دی۔ مگر زبان کی لکنت اور لہجے کی ہچکچاہٹ خبر دیتی رہی کہ یہ اذان کس جذبے کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ جوں توں کر کے اذان کا مرحلہ ختم ہؤا۔ لوگ ابھی دعا ہی مانگ رہے تھے کہ داعی دین سیدھا اپنے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ لوگ سمجھے کہ حضرت وضو کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر وہ یکایک سوٹ اور ہیٹ پہنے ٹینس کا ریکٹ بغل میں لیے برآمد ہوئے اور موٹر میں بیٹھ کر سیدھے کلب کی جانب چل پڑے۔ یہ عجیب حرکت دیکھ کر مجمع میں پھر ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ کچھ لوگ موٹر کے پیچھے دوڑے، کچھ اُس کے آگے آن کھڑے ہوئے اور کلب کا راستہ روک لیا۔ داعی دین نے برافروختہ ہو کر لوگوں کو بہت گالیاں دیں اور چاہا کہ راستہ روکنے والوں کو کچلتا ہؤا آگے بڑھ جائے۔ مگر

کامیابی نہ ہوئی مجبوراً رک جانا پڑا۔ اب مجمع اصرار کر رہا ہے کہ موٹر مسجد کی طرف چلے۔ اور داعیٔ اسلام صاحب اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ ذرا نکل بھاگنے کا راستہ ملے تو سیدھے کلب کی راہ لیں۔ اس کشمکش کے دوران میں کبھی وہ خود اپنی زبان سے یہ نہیں فرماتے کہ میں نماز کا قائل نہیں ہوں یا مسجد جانے کے لیے راضی نہیں ہوں۔ مگر حال یہ ہے کہ مجمع میں جو دس بیس منافق ادھر ادھر بکھرے کھڑے ہیں ان میں سے ہر ایک کو حضرت اس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں جیسے کہ یہی تنکا انہیں ڈوبنے سے بچائے گا۔ کوئی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے پکار کر کہتا ہے کہ "میاں، کس مسجد کی طرف چلیں؟ اہل حدیث کی، حنفیوں کی، یا شیعوں کی؟ تمہاری کوئی ایک مسجد ہو تو اس کی طرف چلیں"۔ یہ آواز سنتے ہی حضرت داعیٔ اسلام کی جان میں جان آجاتی ہے اور وہ نظریں بچا کر نوٹوں کا ایک بنڈل اس کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ "کوئی قرآن سے نماز کا طریقہ بتا دے تو میں اسے انعام دوں"۔ داعیٔ اسلام صاحب فوراً اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ادب سے لپے ہیں فرماتے ہیں کہ "حضرت آپ جیسا قیمتی آدمی وہاں کہاں کھڑا ہے، آئیے میری موٹر میں تشریف رکھیے"۔ اس طرح یہ تجدید دین کا نیک ارادہ رکھنے والے بزرگ ہر طرف سے منافقین کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے گرد جمع کر رہے ہیں تاکہ ان کا بھی ایک جتھہ بن جائے اور اس کی مدد سے موٹر کو کلب کی طرف لے بھاگنے کا موقع مل جائے۔ لیکن یہ تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ اگر یہ سب جمع بھی ہو جائیں تو مجمع عام کے مقابلے میں کچھ نہیں بنا سکتے۔

یہ ہے مثال اس قیادت کی جس نے اسلامی حکومت کے قیام کا وعدہ کر کے، اور "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ" کہہ کر مسلمانوں کو اپنے پیچھے لگایا تھا جب تک اس وعدے کو وفا کرنے کا وقت نہ آیا تھا، اس قیادت کی ساکھ مسلمانوں میں جمی رہی۔ اس پر مسلمانوں نے اتنا اعتماد کیا جتنا شاید ہی کسی قوم نے اپنی قومی قیادت پر کیا ہو۔ اس کے اشارۂ ابرو پر ساری قوم حرکت کرتی رہی۔ اس کی تمام کمزوریاں اور خامیاں روز روشن میں مسلمانوں کے سامنے آئیں مگر انہوں نے محض اس مقصد عظیم

کی خاطر ان کی طرف سے آنکھیں بند کریں، اور لاکھوں جانیں، اربوں روپے کی جائدادیں اور ہزارہا عصمتیں قربان کرکے اس قیادت کو وہ اقتدار دلوا کر چھوڑا جس سے وہ اسلامی حکومت کا وعدہ وفا کرنے کے قابل ہو سکے۔ لیکن جب ایفائے عہد کا وقت آگیا اور مسلمان انتظار کرنے لگے کہ یہ قیادت سچے اور ایماندار لوگوں کی طرح خود آگے بڑھ کر اس چیز کا اعلان کرے گی جس کے وعدے پر اس نے اپنی قوم کا یہ اعتماد حاصل کیا تھا، تو مہینوں پر مہینے گزرتے چلے گئے اور قیادتِ علیا کے مرکز سے صدائے "اذان" بلند نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ آخر کار سارے ملک میں شور برپا ہو گیا۔ ہر طرف سے تقاضے شروع ہوئے تار بھیجے گئے۔ خطوط کی بھرمار ہوئی۔ جلسوں میں مطالبے کیے گئے۔ تب کہیں قیامِ پاکستان کے انیس مہینے بعد قراردادِ مقاصد کی "اذان" دی گئی اور وہ بھی صاف الفاظ میں نہیں بلکہ ایسے پیچدار الفاظ میں جن سے بس منطقی استنباط ہی کے طور پر اسلامی حکومت کا مفہوم اخذ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک طویل وقفہ آیا جس میں لوگ انتظار کرتے رہے کہ اب کچھ اُس "وضو" کی تیاریاں کی جائیں گی جو اسلامی حکومت کی نماز کے لیے ضروری ہے۔ کچھ حکومت کے رنگ ڈھنگ بدلیں گے۔ کچھ نظامِ تعلیم بدلیگا۔ کچھ قوانین میں ردّوبدل ہوگا۔ کچھ عوام کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کی تدبیریں کی جائیں گی۔ کچھ کارپردازانِ حکومت کے اخلاق درست ہونگے۔ اور خود لیڈر صاحبان بھی کچھ اپنے طور طریقے ٹھیک کریں گے۔ مگر وہاں سب کچھ اِن امیدوں کے برعکس ہوتا رہا اور "اذان" کے اٹھارہ مہینے بعد یکایک یہ قیادت وہ دستوری سفارشات لیے ہوئے برآمد ہوئی جن میں صریح طور پر اسلامی حکومت کے بجائے ایک لادینی حکومت کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ لوگوں کے ہوشیار ہونے سے پہلے ہی گاڑی "سیکولرزم" کی طرف چلادی جائے، چنانچہ بنیادی حقوق کی رپورٹ جھٹ پٹ دستور ساز اسمبلی میں پاس کر بھی ڈالی گئی، مگر بنیادی اصولوں کا معاملہ اٹک کر رہ گیا اور لوگوں نے ہر طرف سے ہجوم کرکے گاڑی روک لی۔ اس کے بعد سے اب تک پورے ستائیس مہینے اس حال میں گزرے ہیں کہ ایک طرف مسلمان من حیث القوم اُس اسلامی نظام کا مطالبہ کرتے رہے ہیں جس کا وعدہ کرکے ان سے قیامِ پاکستان کے لیے اتنی ہولناک قربانیاں کرائی گئی تھیں، اور دوسری طرف یہ قیادت اس سے یوں جان بچاتی رہی ہے جیسے

کہ اسلامی نظام کسی پھانسی کا نام ہے جو اس کے گلے میں ڈالی جانے والی ہے۔ اس دوران میں اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا کہ اسلام کے دستوری اصول اُسے پسند نہیں ہیں۔ زبان سے وہ اسلام ہی اسلام پکارتی رہی ہے۔ مگر عملاً اس نے ملک بھر سے چُن چُن کر منافقوں کو اکٹھا کیا ہے تاکہ وہ اسلام اور اس کے دستور اور قانون کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائیں۔ روپے دے دے کر دینی حکومت کے خلاف اور لادینی حکومت کے حق میں مضامین لکھوائے ہیں۔ ہر اس شخص کی پیٹھ ٹھونکی ہے جو مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو ابھار ابھار کر سامنے لاتے اور اسلامی ریاست کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ پرانے پرانے بدنام کمیونسٹوں تک کو اس نے اسلام کے خلاف استعمال کرنے میں باک نہیں کیا ہے۔ جس شخص کو بھی اس کے دربار میں اعزاز حاصل کرنا ہوتا ہے وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اٹھ کر اسلامی دستور کے مطالبے کو چیلنج کر دیتا ہے اور اس کے چند ہی روز بعد ہم سنتے ہیں کہ اسے کوئی بڑی تنخواہ یا کوئی اونچی کرسی پیش کر دی گئی۔

اس روش کا حاصل کیا ہوا ہے؟ شاید دنیا میں کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملیگی کہ کوئی قیادت پانچ سال کی مختصر مدت میں اپنی قوم کے اندر عزت اور محبوبیت کے اتنے اونچے مقام سے گر کر ذلت اور مبغوضیت کی اتنی نیچی سطح تک گر گئی ہو۔ آج ہزار میں ایک مسلمان بھی مشکل ہی سے ایسا ملتا ہے جو ان لوگوں کو کلمۂ خیر سے یاد کرتا ہو۔ آج ایک راہ چلتے آدمی کو آپ ذرا چھیڑ کر اس کے سامنے ان کا ذکر کر دیں، پھر آپ سن لیں گے کہ وہ کن الفاظ سے ان کی تواضع کرتا ہے۔ آج حالت یہ ہوگئی ہے کہ ریلوں میں، بسوں میں، بازاروں میں، اور چار آدمیوں کی کسی سوسائٹی میں کہیں کوئی شخص اگر ان کی مدافعت میں ایک لفظ زبان سے نکال دے تو اس کو اپنی جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ نفرت اور ناراضی کا ایک طوفان ہے جو دلوں سے اُبل رہا ہے اور زبانوں سے نکلا پڑتا ہے۔ سرکاری ملازمین تک، جو برسرِ اقتدار گروہ کی مخالفت سے متاثر ہونے میں عموماً سب سے پیچھے ہوا کرتے ہیں، یہ عام ناراضی پھیل چکی ہے، اور چھوٹے کارکنوں سے لیکر بڑے سے بڑے افسروں تک جس کو دیکھیے اس

قیادت کے خلاف شکوہ سنج نظر آ رہا ہے۔ ایک نہایت ناقابلِ لحاظ اقلیت کے سوا جس کی موت وزیست اسی قیادت کی کشتی سے وابستہ ہے، اب کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ عام لوگ اس سے بیزار بھی ہیں اور مایوس بھی — یہ جو کچھ ہوا ہے ٹھیک قانونِ فطرت کے مطابق ہوا ہے۔ خدا اور اس کے دین سے مکاری کرنے والے کبھی دنیا میں باعزت نہیں رہ سکتے ہیں۔

اس درجہ بے وقار اور ساقط الاعتبار ہو چکنے کے بعد اب بھی یہ قیادت اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ قوم کی عام خواہش کو ٹھکرا کر زبردستی اپنی من مانی چلائے۔ یہ جسارت آخر کس بھروسے پر کی جا رہی ہے؟ جن چیزوں پر یہ لوگ اعتماد کیے ہوئے ہیں وہ صرف تین ہیں:-

اوّل یہ کہ ان کی آئینی پوزیشن مضبوط ہے۔ قبلِ تقسیم کے مخصوص حالات میں مجلس دستور ساز (جو ملک کی پارلیمنٹ بھی ہے) اس طرح بنائی گئی تھی کہ اس میں نہ صرف اُس وقت مسلم لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی، بلکہ جب تک نیا دستور نہ بن جائے، اس کی یہ اکثریت جوں کی توں قائم رہے گی۔ یہ اسمبلی اس پوزیشن میں ہے کہ تمام ملک کی متحدہ مزاحمت کے باوجود اپنی مرضی کا ایک دستور بنا سکتی ہے اور وہ دستور آئینی طور پر ملک کا دستور قرار پا سکتا ہے۔

دوم یہ کہ ملک کا نظم و نسق عملاً اس وقت ان کے قبضے میں ہے۔ خزانہ، فوج، پولیس، عدالت، جیل، سب ان کے ہاتھ میں ہیں، اور بڑی حد تک تجارت اور خوراک کی کنجیوں پر بھی وہ قابض ہیں۔ ان کو اعتماد ہے کہ ان طاقتوں سے کام لے کر وہ لوگوں کی عام ناراضی کے باوجود زبردستی اپنا من مانا دستور نافذ کر سکیں گے اور پچھلے صوبائی انتخابات میں جو "کامیاب" تجربے وہ کر چکے ہیں ان کی بنا پر وہ امید رکھتے ہیں کہ لوگ اگر سو فیصدی بھی ان سے ناراض ہوں تو وہ کم از کم ۹۰ فیصدی ووٹ اپنے انتخابی کرتبوں سے ضرور حاصل کر لے جائیں گے۔ اس طرح نہ صرف آج، بلکہ آئندہ بھی وہ اقتدار پر قابض رہنے کی پوری توقع رکھتے ہیں۔

سوم یہ کہ ان کو اپنی قوم کی جہالت اور اخلاقی کمزوریوں پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ

یہاں نہ سرکاری ملازمتوں میں ایمان فروشوں کی کوئی کمی ہے نہ عام پبلک میں، اور قوم کی رائے عام کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کا کوئی طوفان اٹھا کر ہر وقت اس کو فریب دیا جا سکتا ہے۔

یہ تینوں چیزیں بے شک ایسی ہیں کہ دنیا کا ہر نادان گروہ انہیں پا کر نخوت کے نشے میں مست ہو سکتا ہے اور قدیم ترین زمانے کے جباروں سے لے کر شاہ فاروق تک سب اپنے اپنے وقت میں ان سے سرمست ہوتے رہے ہیں۔ مگر اس طرح کے لوگ بالعموم ایک حقیقت کو بھول جاتے ہیں اور وہی ان کے لیے آخر کار تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ ان کو یہ یاد نہیں رہتا کہ عزت اور اقتدار کے لیے اصل ضمانت، طاقت نہیں بلکہ حکمرانوں پر لوگوں کا قلبی اعتماد ہے۔ اور یہ اعتماد اگر حاصل ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ حکمران اپنے اخلاق سے اور اپنی خدمت سے لوگوں کے دل مسخر کریں اور جو قدم بھی اٹھائیں اس کے برحق ہونے پر دلیل و حجت سے لوگوں کو مطمئن کر دیں۔ جو حکمران یہ اعتماد حاصل کر لیتے ہیں ان کو سچی عزت حاصل ہوتی ہے اور ان کا اقتدار مستحکم ہوتا ہے۔ ان کی حکومت ایک بوجھ کی طرح سروں پر لدی ہوئی نہیں ہوتی کہ محض ایک جھٹکا اسے اتار پھینکنے کے لیے کافی ہو، بلکہ اس کی جڑیں لاکھوں کروڑوں بندگان خدا کے قلوب میں گہری جمی ہوئی ہوتی ہیں جن کو اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں ہوتا رہا ہے وہ لوگ جو اس طرح کی چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں جن پر ہماری موجودہ قیادت بھروسہ کر رہی ہے تو وہ ہمیشہ برا انجام دیکھتے رہے ہیں، اور بسا اوقات ان کی حماقتوں سے ان کی پوری قوم پر ایسی تباہیاں نازل ہوئی ہیں جن کی بدولت بعد کی نسلیں صدیوں تک ان پر لعنت کرتی رہی ہیں۔ تاریخ اس قسم کی عبرتناک مثالوں سے بھری پڑی ہے، اور خود اس زمانے میں بھی اس کی نہایت سبق آموز مثالیں ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ اس پر بھی اگر کوئی سبق نہ حاصل کرے تو یہ اس کی اپنی بدقسمتی ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں جماعت اسلامی کے کارکنوں نے اسلامی دستور کے لیے پورے پاکستان کی رائے عام کو ہموار کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کے دوران میں ان کو چند نہایت اہم تجربات ہوئے

ہیں اور ان کو ہم یہاں صرف اس لیے بیان کرتے ہیں کہ اگر موجودہ قیادت میں فکر وبصیرت کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو وہ ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرے۔ ہمارے کارکن اس جدوجہد کے دوران میں شہروں پر، بازاروں میں، جمعے کے اجتماعات میں، محلوں اور گلیوں میں، قصبوں اور دیہات میں، بلا انتخاب ہر شخص تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور ہر ایک کے سامنے انہوں نے اسلامی دستور کا مطالبہ پیش کیا ہے تاکہ اگر وہ اس سے اتفاق رکھتا ہو تو اس کی تائید کرے۔ یہ ایک طرح کا استصواب عام ہے جس کے دوران میں حسب ذیل نتائج مشاہدے میں آئے ہیں:۔

کم از کم ۹۰ فی صدی آدمی ایسے ملے ہیں جنہوں نے بلا تامل اس مطالبے پر نہ صرف دستخط کیے ہیں بلکہ زبان سے اپنے گہرے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے۔

بقیہ دس فی صدی میں بھی عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی پائی گئی ہے جنہوں نے زبان سے اس کی تائید کی ہے، مگر دستخط کرنے سے صرف اس لیے انکار کیا ہے کہ یا تو وہ ملازم ہیں، یا کسی اور طرح موجودہ اقتدار سے ان کا مفاد وابستہ ہے اور ان کو ڈر لگتا ہے کہ اس مطالبے پر اگر ان کے دستخط پائے گئے تو انہیں نقصان پہنچ جائے گا۔

بمشکل ایک فی صدی آدمی ایسے پائے گئے ہیں جنہوں نے اس مطالبے سے یا اس کی کسی شق سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔

کم از کم ۸۰ فیصدی آدمی ایسے پائے گئے ہیں جنہوں نے دستخط کرنے کے ساتھ کسی نہ کسی طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "چاہے ساری قوم بالاتفاق اس چیز کا مطالبہ کرے، مگر ارباب اقتدار کریں گے وہی جو اُن کے جی میں ہے" یہ اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ لوگ بالعموم موجودہ قیادت سے مایوس ہیں اور یہ خیال اُن کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ قیادت اب استبداد پر اتر آئی ہے اور اسے رائے عام کی بالکل پروا نہیں ہے۔

کم از کم ۲۵ فیصدی آدمی ایسے ملے ہیں جنہوں نے دستخط کرتے ہوئے صرف مذکورۂ بالا مایوسانہ خیالات ہی ظاہر کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ علانیہ کہا کہ "صاحب اِن جلسوں اور قرار دادوں (باقی ص ۴۲ پر)

(بقیہ اشارات) اور محضر ناموں سے کچھ نہیں بنیگا، یہ لوگ سیدھی طرح بات ماننے والے نہیں ہیں" اگرچہ پہلے بھی اندازہ تھا کہ ملک میں بہت سے لوگ اب اس طرح سوچنے لگے ہیں، مگر پچھلے چند مہینوں کے ربطِ عوام سے پہلی مرتبہ ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ رجحانات ملک کی آبادی کے اتنے کثیر حصے میں سرایت کر چکے ہیں۔ اب یہ ہر شخص خود سوچ لے کہ جس قیادت نے ملک میں یہ احساسات اُبھار دیے ہیں وہ سعادت کی راہ پر جا رہی ہے یا نحوست کی راہ پر؟

ممکن ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار خود اس طرح سوچ رہے ہوں کہ کسی نے اگر قرآن و حدیث سے اسلام کے دستوری اصول بالکل قطعی اور بیّن طور پر پیش کر دیے تو کیا؟ کسی مجلس میں تمام اسلامی فرقوں کے علماء نے اسلامی ریاست کی دستوری بنیادیں بالاتفاق مرتب کر دیں تو کیا؟ کسی نے اگر ہماری دستوری تجویزوں کو دلائل سے غلط ثابت کر دیا تو کیا؟ لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں نے بھی اگر تار اور خط اور محضر نامے بھیج کر اور قرار دادیں پاس کر کے اسلامی دستور کے اصول تسلیم کرنے کا تقاضا کر ڈالا تو کیا؟ دستور بنانے کے آئینی طور پر مجاز تو ہم ہیں۔ اصل چیز باہر کی رائے نہیں بلکہ دستور ساز اسمبلی کے اندر کی رائے ہے۔ وہ اگر اکثریت کے ساتھ ہماری دستوری تجویزوں کو قبول کر لے تو دستور انہی کے مطابق بن کر رہیگا۔ باہر کے لوگ چیختے ہیں تو چیختے رہیں۔ ہمیں نہ ان کو دلیل سے مطمئن کرنے کی ضرورت، اور نہ اس بات کی پروا کہ کتنے لوگ ہمارے ساتھ ہیں اور کتنے نہیں ہیں۔

یہ اگر ان کا خیال ہے تو ہم ان کے خیر خواہ کی حیثیت سے کہتے ہیں کہ آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اسلامی دستور کے اصول جب قرآن و حدیث سے ثابت کر دیے جا چکے، اور جب تمام اسلامی فرقوں کے علماء ان کی تصدیق کر دیں، اور جب جلسوں اور قرار دادوں اور خطوط اور محضر ناموں سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ قوم کی عظیم اکثریت اپنی قومی ریاست کو انہی اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے، تو آپ کے لیے اور آپ کی پوری اسمبلی کے لیے صرف دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ یا تو اکثریت کے مطالبے کو مان لیجیے۔ یا اگر آپ کے لیے یہ مطالبہ قابل قبول نہیں ہے تو سیدھی طرح تسلیم کر لیجیے کہ آپ اس ملک میں ایک اقلیت ہیں اور اکثریت کے نمائندے نہیں ہیں لہٰذا آپ کو دستور بنانے کا کوئی حق باقی نہیں رہا ہے۔ ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر اگر آپ محض آئینی پوزیشن کے سہارے یا طاقت کے بل پر کوئی تیسرا راستہ اختیار کریں گے تو بدترین نتائج کو دعوت دیں گے۔ کسی اقلیت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اکثریت پر زبردستی اپنی مرضی مسلط کرے، خواہ اسے کیسی ہی مستحکم پوزیشن حاصل ہو۔ اس کی کوشش کر کے وہ عارضی طور پر کامیاب ہو سکتی ہے۔ مگر ایسی کوششوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا ہے۔